R-N-2186157 REGD NO-L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

فون نمبر ۲۹

سالانہ قیمت ۵ روپے

فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

ہماری زبان

جلد ۲۷۔ شمارہ ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم اگست ۱۹۶۸ء

اداریہ

قومی تعلیم کی پالیسی

حکومت ہند نے قومی تعلیم کے متعلق اپنی پالیسی کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی ہے۔ اس قرارداد میں تعلیم کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے اور مرکز اور ریاستوں کے باہمی اشتراک کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرارداد میں مجموعی طور پر بہت اچھی باتیں کہی گئی ہیں، مگر اول تو یہ واضح نہیں ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لیے جو وسائل درکار ہوں گے انھیں کس طرح فراہم کیا جائے گا، دوسرے اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ چونکہ تعلیم دراصل ریاستوں کے دائرۂ اختیار میں ہے، اس لیے مرکز کس طرح ان کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ آزادی کے بیس سال کے بعد تجربہ یہ ہوا کہ اچھی اچھی اسکیمیں اس وجہ سے رہ جاتی ہیں کہ ان کے نفاذ کے لیے جو اقدامات کرنے ہوتے ہیں ان کا پہلے سے کوئی نقشہ نہیں بنایا جاتا، نہ وسائل کی فراہمی کے سوال پر غور ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مرکز اول تو ریاستوں کا ردعمل جلد سے جلد معلوم کرے اور انھیں اپنے ساتھ چلانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے دوسرے ساری اسکیم پر عمل کرنے کے لیے وسائل فراہم کرے۔

قرارداد میں سترہ رہنما اصول ہیں۔ ان میں پہلا چودہ برس کی عمر تک تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا اصول ہے۔ اس کی اہمیت سے کسے انکار ہوگا، مگر اس کے لئے اساتذہ کی فراہمی، کتابوں کی فراہمی، عمارتوں اور ساز و سامان کا جو سوال آتا ہے اسے بھی حل کرنا ہوگا، ورنہ یہ خواب بھی دوسرے خوابوں کی طرح شرمندۂ تعبیر رہے گا۔ دراصل چودہ برس کی عمر تک مفت اور جبری تعلیم، ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے لئے وسائل مہیا کرنا ہر روشن خیال حکومت کا فرض ہے، یہ واقعی شرم کی بات ہے کہ ابھی تک ہم اس معاملے میں اپنی منزل سے بہت دور ہیں اس بنیادی مسئلے پر زور دینے کے بعد قرارداد میں اساتذہ کی مناسب تنخواہوں اور سماج میں ان کی منزلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس بات کو ابھی سبھی مانتے ہیں مگر عمل کا معاملہ دوسرا ہے۔ ابھی تک ابتدائی اور ثانوی درجے کے اساتذہ کی تنخواہیں موجودہ گرانی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں اور گو زبان سے ان کے رتبے کا اعتراف ہوتا ہے مگر درحقیقت آج کل کے کاروباری دور میں استادوں کی کوئی وقعت نہیں ہے خصوصاً ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے استادوں کو تو ہر لحاظ سے حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو جلد سے جلد بدلنا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ قرارداد میں اساتذہ کی ذہنی آزادی کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی عمل کی دنیا میں حالات دوسرے ہیں اور آزادی خیال پر خاص پابندیاں ہیں۔

ہندوستانی زبانوں اور ادبیات خصوصاً علاقائی زبانوں کی ترقی پر بجا طور پر زور دیا گیا ہے اور پہلی دفعہ صاف طور پر یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ مناسب تیاری کے بعد انھیں یونیورسٹی کی منزل پر بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ اصول صرف ان زبانوں کے لئے ہے جو کسی نہ کسی ریاست میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں یا اس کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے جو یوں تو کہنے کو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے مگر دراصل ایک کل ہند زبان ہے اور کئی ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی خاصی بڑی آبادی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے متعلق ایک صراحت نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ہندی کی ریاستوں میں ہندی اور انگریزی کے

علاوہ کوئی ایک جدید ہندوستانی زبان بھی پڑھائی جائے اور ان میں جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے اور غیر ہندی ریاستوں میں، علاقائی زبان اور انگریزی کے علاوہ تیسری زبان کے سلسلے میں ہندی کو ترجیح دی جائے۔ بظاہر یہ بات قومی یکجہتی کے لئے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کے لئے اس طرح بڑی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ہندی ریاستوں میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو لینا چاہیں تو ہو سکتا ہے کہ حکومت اس کے بجائے جنوبی ہند کی کسی زبان کو لینے پر انھیں مجبور کرے اور جنوبی ہند میں "تامل یا تیلگو یا کنڑ یا ملیالم اور انگریزی کے علاوہ اردو لینے سے انھیں روکا جائے اور ہندی لینے پر مجبور کیا جائے۔ اس لئے ہماری رائے میں ہندی ریاستوں میں جنوبی ہند کی زبانوں کو ترجیح نہ دی جائے اور نہ جنوبی ہند میں ہندی لینے پر اصرار کیا جائے، بلکہ اس معاملے میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتے ہوئے طلبہ کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ہندی کی ترقی پر زور دیتے ہوئے اقرارداد میں یہ اچھی بات کہی گئی ہے کہ اسے ہندوستان کی مشترک تہذیب کے تمام عناصر کے اظہار کا وسیلہ بننا ہے، مگر ایک خاص بات رہ گئی ہے یعنی ہندوستانی کی روح اور اس کے مواد کو ملحوظ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے جب کہ دستور کی دفعہ ۳۵۱ میں اس کی صراحت ہے۔

سنسکرت کی اہمیت میں قومی زبانوں کی اہمیت، سائنس، زراعت اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ، اچھی اور معیاری کتابوں کی تیاری، امتحانات کے طریقے میں اصلاح، عام اسکولوں کی اہمیت، خانگی اور بالغوں کی تعلیم کو بڑھانے کی ضرورت اور دس سال کی اسکول کی تعلیم کے بعد، دو سال کی اعلیٰ ثانوی تعلیم اور تین سال کی یونیورسٹی کی تعلیم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لسانی اقلیتوں کی تعلیم کے سلسلے میں اگست ۱۹۶۱ء کی بڑے وزیروں کی کانفرنس کے بیان کو بنیاد مانا گیا ہے، مگر یہاں لسانی اقلیتوں کی ان کی مادری زبان میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اصول کی صراحت کرنی چاہئے تھی کیونکہ ریاستوں نے ابھی تک ابتدائی تعلیم کے معاملے میں بھی بہت سستی دکھائی ہے اور اس وجہ سے لسانی اقلیتوں میں بڑی بددلی اور مایوسی ہے۔

مجموعی طور پر حکومت ہند کی یہ قرارداد قابل قدر ہے، مگر اس قسم کے بیان تو پہلے بھی دئے جا چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ان پر عمل کتنا اور کس طرح ہوتا ہے۔

فقیر وحید الدین کا انتقال

لاہور-۲۳ر جولائی۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب کرنل فقیر وحید الدین کا انتقال گزشتہ اتوار کو کراچی میں ہو گیا۔ مرحوم لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے بزرگ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال سے دیرینہ نیازمندی اور گہری عقیدت کی بناء پر انھوں نے علامہ کی زندگی اور افکار پر "روزگار فقیر" اور "اقبال، ان پیچرز" مرتب کر کے شائع کیا۔ انھوں نے حال ہی میں جناب فیض احمد فیض کے تعاون سے اقبال کی تعلیمات پر ایک فلم بھی تیار کی تھی۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی کتاب محسن اعظم بھی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ انھوں نے اپنے نامور ہم عصروں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک ادبی شاہکار انجمن کے نام سے تصنیف کیا۔ (قومی آواز)

رؤف خیر

پناہ

بے تحاشہ دوڑتا ہے
اک سراسیمہ ہرن
اڑ رہا ہے دور تک اس کی چھلانگوں سے غبار
اک شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے دیر سے

خوف کا مارا،
پریشاں،
تھر تھراتا یہ ہرن
ایک بھوکے شیر کے مسکن میں لیتا ہے پناہ

شفا گوالیاری کی وفات

بھوپال۔ اردو کے مشہور شاعر شفا گوالیاری کا ۲۲ر جولائی کو انتقال ہو گیا۔ آپ علامہ سیماب کے فارغ الاصلاح شاگرد تھے۔ آپ کے کلام کے چار مجموعے "آیات شفا، شاخ زیتون، نبض حیات، اور پرچم اردو" شائع ہو چکے ہیں پانچواں مجموعہ کلام "زخم گل" ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دو سال قبل رسالہ "شیخ ادب" سلطان پور نے شفا نمبر بھی نکالا تھا۔

روسی ادیب سیاسی پناہ لینے امریکہ پہنچ گئے

واشنگٹن۔ امریکی محکمۂ خارجہ کے ایک ترجمان نے جمعہ کو اعلان کیا ہے کہ ۴۰ سالہ روسی ادیب ارکادی بیلنکوف اور ان کی بیوی میوزخ نے امریکی قونصل خانہ سے پاسپورٹ کا ویزا حاصل کرنے کے بعد سیاسی پناہ لینے امریکہ آپہنچے ہیں۔

(سیاست)

محمد ایوب واقف

سید سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر یلدرم نے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہٹور کے ایک ممتاز گھرانے میں ۱۸۸۰ء میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد خان بہادر سید جلال الدین بڑی پرشکوہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مختلف اونچے اونچے عہدوں پر سرفراز رہے لیکن ان کے مزاج میں غرور کبھی نہ پیدا ہوا۔ وہ ایک متواضع، منکسر مزاج اور بااخلاق انسان تھے۔ شرافت اور دلنوازی میں تو ان کا خاندان ہمیشہ سے ممتاز تھا خود یلدرم مرحوم صد درجہ شریف اور پاک طینت انسان تھے۔ قرۃ العین حیدر جو مرحوم کی دختر ہیں انھوں نے بھی باپ کی شرافت اور نیکی سے اپنی زندگی کو طرحدار کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کا بچپن گنگا اور جمنا کے دلکش و دلآویز کناروں پر گذرا جہاں سے ان کی طبیعت کو لازوال رنگینی و رعنائی ملی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اسکول میں داخل کرائے گئے۔ وہ ذہین بھی تھے اور محنتی بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی امتحانات کامیاب کرنے کے بعد جب وہ ایف۔اے کے امتحان میں بیٹھے تو الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی و فارسی میں اول آئے۔ اور بی اے کے امتحان میں وہ سارے صوبے میں سکنڈ تھے۔ طبعاً وہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ وہ کالج کی اور کالج سے باہر کی تمام ادبی سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے ایک بار وہ کالج یونین کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے جس زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ میں طالب علم تھے مولانا شبلی وہاں فارسی کے پروفیسر تھے۔ چونکہ یلدرم کو فارسی سے خصوصاً لگاؤ تھا۔ اس لئے مولانا کو ان سے انسیت ہوگئی تھی۔ شبلی ہی کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ یلدرم اردو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ اس زمانے میں انھوں نے چھوٹی بڑی کئی نظمیں لکھیں جنھیں ان کے معاصرین نے پسند کیا۔ انھوں نے اچھوتے موضوعات اور اعلیٰ خیالات کے ذریعہ اردو شاعری میں جامعیت پیدا کی۔ شاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ کبھی نہیں بنایا اور نہ ہی اسے تفریح دلفن کا ذریعہ سمجھا۔ شعر کہتے وقت انھیں اپنے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا تھا بلکہ ان کی موزونیت طبع خود انھیں مجبور کرتی تھی۔

سید سجاد حیدر یلدرم ایک جلیل القدر نثار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت شاعر بھی تھے۔ اور یہ بھی حق بجانب ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مقتضائے وقت کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ایک امر مسلّم ہے کہ انھیں جو غیر معمولی شہرت و مقبولیت ملی وہ صرف ان کے نثری کارناموں کا نتیجہ ہے۔ یلدرم نے لکھنا اس وقت شروع کیا جب وہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے اپنے شوق، دلچسپی اور مشق سے بہت جلد افسانہ نگاری میں مہارت پیدا کرلی۔ ان کی کہانیاں ملک کے موقر رسالوں مثلاً "معارف علی گڑھ" "اردوئے معلی" "مخزن" (دور اول) علی گڑھ میگزین وغیرہ میں چھپنے لگیں۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ترکی زبان سیکھنا شروع کی اور ایک قلیل مدت میں اس غیر ملکی زبان پر اتنی قدرت حاصل کرلی کہ وہ اس زبان کے ڈراموں اور کہانیوں کے ترجمے اپنی زبان میں کرنے لگے۔ انھوں نے ترکی ادب کو اردو ادب سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ وہ جس زمانے میں علی گڑھ کالج میں ایل۔ ایل۔ بی کر رہے تھے فارن آفس سے علی گڑھ کے ایک پروفیسر کے یہاں خط آیا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانہ کے لیے ترکی زبان کے ایک ترجمان کی ضرورت ہے پروفیسر موصوف نے یلدرم سے کہا کہ وہ اس پیش کش کو قبول کرلیں یلدرم نے اسے قبول کرلیا اور وہ بغداد کے لئے روانہ ہوگئے۔ بغداد پہنچنے کے بعد ان کی ادبی سرگرمیوں میں کسی طرح کی کمی نہ آئی بلکہ ان میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہاں سے وہ ترکی ڈراموں اور افسانوں کے ترجمے ہندوستانی رسالوں میں ارسال کرتے رہے۔ ان کے ترجموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمے نہیں ہیں بلکہ ان کی تخلیقات ہیں۔ کیونکہ ترجمہ کرتے وقت انھوں نے ایک مترجم ہی کی حیثیت کو نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ اگر قلم ان کا مترجم کا تھا تو ذہن ایک افسانہ نگار کا۔ ان کے تراجم و تخلیقات سے اردو ادب میں ایک نئے طرز نگارش یعنی ادب لطیف کی بنیاد پڑی مولانا سید سلیمان ندوی مکاتیب مہدی" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"آج کل رنگ و برگ دنیا" ادب لطیف" پر مٹ رہی ہے۔ پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گری سے مسحور کر رکھا ہے۔ مشرقی زبانوں میں فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلی بار اٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا سینہ کم از کم تین سو برس سے یورپ کے مشق ناز کا نشانہ ہے یعنی ترک۔ ترکوں نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس کی محبوبہ کو پہلو میں پایا۔ اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان میں پھیلی اور اس لئے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر یلدرم ایک علیگ۔ طالب علم کو ترکی پڑھوائی اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت خانہ کے لیے کارآمد ٹھہرایا۔ اس لیے" زمانی قرب" اس کو ترکوں کا اور" مکانی قرب" بھی بخشا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم ہی کو آج سے ۳۰ سال پہلے ترکی منقوحات کو ہندوستانی منقوحات کی صورت میں بدنا شروع کیا اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے" ادب لطیف"

کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اردو رسالے کے صفحات پر نظر آتی ہیں۔"

ترکی ڈراموں اور ناولوں کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے زنانہ کردار پر خاص توجہ دی ہے۔ در اصل وہ عورتوں کو آزادی دینے کے حق میں تھے۔ مغربی علوم و فنون کے ذریعہ وہ خواتین میں وسعتِ نظر اور بلندیٔ فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ان خیالات کی مخالفت کی گئی لیکن وہ برابر کوشش کرتے رہے۔ وہ اس طرح کے جلسے جلوس میں بڑی مسرت کے ساتھ شرکت کرتے جن میں آزادیٔ نسواں کی مانگ کی جاتی۔ وہ ان عورتوں سے مل کر بے انتہا خوش ہوتے تھے جو آزاد خیال ہوتی تھیں۔ سر شیخ عبد القادر مرحوم اپنی ایک تحریر میں یوں رقمطراز ہیں۔

"۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی ایک اعلیٰ کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ سید سجاد حیدر یلدرم بھی شریک تھے۔ ایک دن جب میں جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کے قریب جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد حیدر یلدرم آتے دکھ پڑے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کئی ایک چکر لگائے۔ مجھ سے کہنے لگے کچھ نہ پوچھیے میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا کچھ تو بتاؤ کیا دیکھا ہے کہنے لگے ایک ایسی خاتون سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامل ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں۔"

سجاد حیدر یلدرم آزادیٔ نسواں کے قائل ضرور تھے لیکن بقول قرۃ العین حیدر "جدید کلب لائف" اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین انھیں سخت ناپسند تھیں۔ قسطنطنیہ، بغداد وغیرہ میں سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کی شادی ایک معزز خاندان کی خاتون سے ہوئی جو بذاتِ خود ایک ممتاز ادیبہ تھیں اور شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئیں۔ ترکِ موالات کے زمانہ میں نذر سجاد صاحبہ نے بڑی گرم جوشی سے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ایک بار وہ سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر بھی گئی تھیں۔

غیر ملکی اقامت کے بعد یلدرم جب ہندوستان آئے تو کچھ دنوں تک وہ یو۔پی میں سرکاری خدمات انجام دیتے رہے پھر مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ حکومتِ ہند کے اصرار پر پھر وہ سرکاری ملازمت میں آ گئے اس سلسلے میں ان کو انڈمان و نکوبار بھیجا گیا۔ آخر میں پھر ان کا تبادلہ ہندوستان میں ہوا۔ اور وہ غازی پور و اناوہ کے ضلعوں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انھیں سرکاری کاموں سے فرصت مل گئی اور وہ حج بیت اللہ کے لئے گئے۔

سجاد حیدر یلدرم نے اردو ادب کے خزانے میں بہت اضافے کئے۔ انھوں نے طبع زاد افسانے لکھے، مضامین تحریر کئے۔ ترکی کہانیوں، ڈراموں اور ناولوں کے ترجمے کئے۔ ان میں "خیالستان" جو ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے شاہکار ہے اس میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ ترکی قصّوں کے ترجمے۔ اس کتاب میں یلدرم کی رومانیت اور ان کی اعلیٰ تخیل کی مثالیں بھی مل سکتی ہیں اور حسین دلکش اور کیف و وجد میں ڈوبی ہوئی تصویریں بھی ابھرتی ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست اور روانی ہے جس سے قاری ذہنی طور پر محظوظ ہو سکتا ہے اس سے قطع نظر "ہما خانم" "پرانا خواب" "آسیب الفت" "جنگ و جدل" اور "جلال الدین خوارزم" وغیرہ تراجم بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

پچھلے تین چار برسوں میں ہمارے یہاں جن نوجوان لکھنے والوں نے اپنی تحریروں سے ادبی حلقوں کو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام اب بہت نمایاں ہو چکا ہے۔ یوں تو انھوں نے متعدد ادبی مباحث پر مضامین و مقالات لکھ کر اپنی غیر معمولی ذہانت اور تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے مگر ان کی جن تحریروں نے پڑھنے والوں کو سب سے زیادہ چونکایا ہے وہ ان کے تبصرے ہیں جو اردو کی بعض اہم کتابوں پر الہ آباد سے شائع ہونے والے جریدہ "شب خون" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان تبصروں میں جس قسم کی بے خوفی اور دیانت داری کو روا رکھا گیا ہے اور ہر قسم کی مروت اور مصلحت سے بلند ہو کر جس بے لاگ اور معروضی انداز میں زیر بحث مصنفین کے حسن و قبح پر اظہار خیال کی کوشش کی گئی ہے اس کے ابھی ہم زیادہ عادی نہیں ہیں اس لئے ان تبصروں کی اشاعت سے تبصرہ نگار کو وہ نیک نامی حاصل نہ ہو سکی جس کی تمنا ہر نئے لکھنے والے کو ہوتی ہے۔ ان تبصروں کے ردعمل میں جو خطوط یا جوابی قسم کی تحریریں شائع ہوئیں اور ان میں سخن فہمی کے بجائے طرفداری کا جو مظاہرہ کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں مصنف اور ناشر اپنی کتابیں تبصرے کی غرض سے بھیجتے ہیں تو ان کے ذہن میں محض یہ تصور کارفرما ہوتا ہے کہ تبصرہ بھی ایک طرح کا اشتہار ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کو کتاب کی خریداری کی ترغیب دیتا ہے۔ فاروقی نے نہ صرف یہ کہ اس روایت پر کاری ضرب لگائی ہے بلکہ ان تبصروں کو کتابی صورت میں شائع کر کے پڑھنے والوں کو ایک بار پھر بحث و تمحیص کی دعوت دی ہے۔

عادل جعفری

غزل

یہ بات اور ہے کہیے سویرا ہے
اندھیرا کل بھی تھا اور آج بھی اندھیرا ہے

زباں تو چلنے کو یاروں کی خوب چلتی ہے
عمل کی دنیا میں ان کے گھٹا اندھیرا ہے

الٹ پلٹ گئی ساری بساط استادی
تلامذہ! یہ نئی شاعری کا پھیرا ہے

یہاں تو شام ہی کیا صبح بھی اندھیری ہے
یہ میر کا نہیں، گھر، دوستو یہ میرا ہے

کبھی خوشی سے مرے گھر کا رخ کبھی تو کرے
بہت دنوں سے یہاں غم ہی غم کا ڈیرا ہے

یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں تبصرے کی روایت بہت زیادہ جاندار نہیں رہی ہے اور تبصرے کا مقصد عام طور پر کتاب کا سرسری تعارف یا کچھ اشتہاری قسم کی رایوں کا اظہار ہوتا تھا اور اگر اس کے خلاف عمل ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تبصرہ نگار کو مصنف یا کتاب سے کوئی خاص پرخاش ہے اور یہ تبصرہ محض اس کتاب میں کیڑے نکالنے یا مصنف کی شہرت پر خاک ڈالنے کے لئے لکھا گیا ہے یعنی اس طور پر بھی تصویر کا ایک ہی رخ سامنے آتا تھا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے تبصرے لکھے ہی نہ گئے ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے کتابوں پر تفصیلی تبصروں کا سلسلہ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو میں شروع کیا تھا۔ مولوی صاحب نے خود بھی متعدد کتابوں پر بہت تفصیلی بے لاگ اور متوازن تبصرے کئے اور بعض دوسرے ادیبوں سے بھی اسی نوعیت کے تبصرے لکھوائے۔ مولوی صاحب کے تبصروں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اور رسالہ اردو میں اختر حسین رائے پوری، جلیل قدوائی اور عزیز احمد کے تبصرے بعض لوگوں کو اب بھی یاد ہوں گے۔ پریم چند کے ناول "میدان عمل" پر اختر حسین رائے پوری کا تبصرہ اور مجاز کے مجموعۂ کلام "آہنگ" کے پہلے ایڈیشن پر جلیل قدوائی کی بے لاگ تنقیدی رائے اس سلسلے میں خاص طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ علی گڑھ میگزین میں بھی بے لاگ تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں۔ "انگارے" جب نئی نئی شائع ہوئی تھی تو آل احمد سرور نے اس پر ایسا منصفانہ تبصرہ کیا تھا جس کی دھوم بہت دنوں تک قائم رہی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے رسالہ "سہیل" میں سرور صاحب نے اردو کی بعض اہم مطبوعات مثلاً شبلی کے خطوط" اور "بال جبریل" وغیرہ پر مفصل اور متوازن تبصرے لکھ کر تبصرہ نگاری کی روایت کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ کم کم سہی لیکن کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا ہے۔ ممتاز شیریں نے بنگلور سے "نیا دور" نکالا تو اس میں تبصروں کا حصہ بہت اہم ہوتا تھا۔ عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" اور سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" پر عزیز احمد کے تبصرے اور عبدالقادر سروری کی تصنیف "جدید اردو شاعری" پر محمد حسن عسکری کی بے لاگ تنقید اب بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد تبصروں کی اس روایت کو صرف محمود ایاز نے اپنے رسالہ "سوغات" میں برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ محمود ایاز نے بعض بہت اچھے تبصرے کئے جن میں اختر الایمان

کے مجموعۂ کلام "آب جو"، ممتاز شیریں کے "میگھ ملہار" اور قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" پر تبصرے اردو زبان کے چند معیاری تبصروں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی کے تبصرے جن لوگوں نے پڑھے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ وہ ان چند لکھنے والوں میں ہیں جن کی مغرب اور مشرق کے ادب پر گہری نظر ہے۔ وہ اپنے تبصرے کو صرف زیر بحث کتاب تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کے وسیلے سے ادب کے بعض اہم مسائل پر اپنے سوچے سمجھے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان خیالات سے اتفاق ضروری نہیں لیکن یہ ہمیں غور و فکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں اور اپنے بہت سے تاثرات و تعصبات پر نظر ثانی کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

فاروقی کے متعلق یہ رائے عام طور پر سننے میں آئی کہ وہ نئی شاعری کے اندھے پرستاروں میں ہیں اور اس کی جا و بیجا حمایت ان کا مقصد زندگی ہے۔ مگر زیر نظر کتاب میں سب سے پہلا تبصرہ جو نئے شعراء کے ایک انتخابی مجموعہ "آبگینے" (شائع کردہ ادارہ مصنفین، حیدرآباد) پر شامل کیا گیا ہے اس میں فاروقی کی یہ رائے ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

"اس کتاب میں جو بات مجھ وہ دوسرے کے جیسے قاری کو زیادہ کھٹکتی ہے وہ جذباتیت اور سطحیت ہے۔ زیادہ تر نظموں اور غزلوں میں شاعر اپنے تصورات کی ادپری سطح میں الجھا نظر آتا ہے۔ اپنی شخصیت کے نہاں خانوں کے کونے کھدروں کی تلاش کی شاید ہمت نہیں پڑتی یا اگر کبھی ادھر جھانکنے کا موقع مل بھی جاتا ہے تو وہاں جو کچھ دیکھا ہے اسے کسی لمحۂ وقت سے منسلک کرکے اس کا بنیادی ربط یا بے ربطی ڈھونڈھنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ دوسری طرف عشقیہ جذبات کی عمومیت اور روایتی طرز مطالعہ نظموں اور خاص کر غزلوں کے حسن کو ہم رنگی کے زہر بے تریاق کی نذر کر دیتی ہے 'یہ سب تو پہلے بھی کہیں پڑھا تھا' کا احساس جو نئی شاعری کے قاری کو اکثر ہوتا ہے اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں بار بار شدت سے پیدا ہوتا ہے۔"

اسی طرح محمد علوی کے مجموعہ "خالی مکان" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بے لاگ رائے دی ہے۔

"محمد علوی کی خلاقانہ قوت کبھی کبھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہتی ہے اور نتیجے میں ایک طرح کی چیپٹی، تجربہ و تصور سے معرا پھیکی شاعری جنم لیتی ہے گھر یلی کی منڈیر پر اونگھتے اور غرغوں کرتے مٹیالے کبوتر ہوں یا فضائے بسیط میں پرواز کرتے طائر لاہوتی، شعر کا موضوع اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان کا تذکرہ قاری کے ذہن میں تجربے کے کسی سلسلے کو تحریک دے یا معنی خیز امکانات کے دروازے کھولے یا تخیل انگیز خیال پیدا کرے۔ محمد علوی جس طرح کی شاعری کرتے ہیں اس کا توازن بگڑنا بہت مشکل نہیں ہوتا روایتی قسم کی گمبھیر شاعری تو پرانے کار آزمودہ ستونوں کے سہارے ایک اچھی خاصی مضبوط چھت کھڑی بھی کر لیتی ہے لیکن محمد علوی جب توازن ہاتھ سے کھو دیتے ہیں تو کھوکھلی کوڑیوں کی مالا کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں وہ بھی اسی طرح اپنے لہجے اور محاورے کے غلام ہو کر نہ رہ جائیں جس طرح روایتی شاعری کے علمبردار اپنی بے کیف رعایتوں اور بے معنی بہار و خزاں اور گل و بلبل کے مار عنکبوت میں اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ روایتی شعراء کو تو چٹپٹے پن اور سہل انگار لفظ بازی تک آتے آتے سو برس لگے لیکن محمد علوی جس بال سے باریک پل پر کھڑے بارہ گولوں والا کھیل دکھا رہے ہیں اس پر سے گرنے اور الفاظ کے دریائے پرشور میں ڈوبنے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

اب ایک اور نئے شاعر راج نرائن راز کے شعری مجموعے "اساڑھ کی چاندنی" پر تبصرے کے ذیل میں یہ سطریں دیکھئے۔

"انھوں نے علامت کو محض استعارہ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لئے ان کی شاعری ذاتی رنگ میں رنگی ہونے کے باوجود کسی مکمل اور گہری علامت کا اظہار نہ بن کر اکہرے استعاروں کی محدود شاعری ہو کر رہ گئی ہے اس کے علاوہ ان کی شاعری میں تجربے کو عام، غیر منقلب اور تقریباً نثری زبان میں بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے .... راج نرائن راز چونکہ بالکل سامنے کی باتوں سے رس نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ان کی نظموں میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

زبیر رضوی کے مجموعہ "لہر لہر ندیا گہری" پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان کے زیادہ تر کلام کا دھندلا سا روشن تاثر ذہن پر قائم رہ جاتا ہے لیکن کوئی واضح صورت نہیں بن پاتی جو مردانہ شاعری کا خاصہ ہے۔"

یہ مثالیں میں نے اس لئے فراہم کی ہیں کہ فاروقی کے متعلق یہ خیال کہ وہ محض پرانے یا ترقی پسند شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے سنگ دلی، دبے رحمی اختیار کرتے ہیں اور نئے شعراء کی محض پیٹھ ٹھونکنا ان کا مشغلہ ہے کسی صورت صحیح نہیں ہے۔

فاروقی نے جن کتابوں پر ہنگامہ خیز تبصرے کئے ہیں ان میں سکندر علی وجد

کا مجموعہ "اوراق مصور" مخدوم محی الدین کا "بساط رقص" اور سردار جعفری کے مجموعے "ایک خواب اور" اور "پیراہن شرر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تبصروں کی خوبی یہ نہیں ہے کہ یہ بہت متوازن ہیں یا ان میں جو رائیں دی گئی ہیں ان سب سے اتفاق کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بات قابل قدر ہے کہ ان مشہور اور مسلم الثبوت شعرا کے بارے میں عام تنقیدی رایوں سے مرعوب ہوئے بغیر لکھنے والے نے اپنی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بعض خیال انگیز باتیں کہی ہیں۔

وحید کے مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو چپٹی یا افتادہ کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں۔

"اس چپٹی یا افتادگی، سطحیت یا غیر قطعیت کی سب سے بڑی وجہ شاعر کے ذہن میں اس تجسس، کرید، بے چینی اور کرب کی کمی ہے جو اسے کسی چیز کی صوری قیمت کو قبول کرنے سے روکتا ہے اور اسے سوال کرنے، پوچھنے اور الجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے ادب بلکہ ہر اچھے ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی سوالیہ نشان ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آج کا شاعر سوال نہیں کرتا تو اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کم بچ رہتا ہے۔"

اسی طرح وحید کی مقبول عام نظموں "اجنتا" اور "ایلورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں تعمیم زدہ شاعری کا نمونہ قرار دیا ہے جس سے اس چیز کی کوئی تصویر ذہن میں نہیں ابھرتی جس پہ یہ نظم لکھی گئی ہو مثال کے طور پر اگر ان کے عنوان تبدیل کر کے "اجنتا" والی نظم پر "ایلورا" یا "ایلورا" پر "اجنتا" کے عنوان دے دئے جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا بلکہ یہ اشعار کھجوراہو کے مندر، ایلیفنٹا کے غار یا کسی اور آثار قدیمہ پر منطبق کئے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔"

وحید پر یہ تبصرہ بڑی حد تک صحیح ہے مگر فاروقی نے ان کی غزل کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وحید بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے میں استادانہ کہتے سے تعبیر کرتا ہوں یعنی لہجے میں ایک اعتماد اور وقار اور ادائیگی خیال میں ایک دھوکا دینے والی آسانی اس نے کہ شعر بظاہر بلا کسی غیر معمولی کوشش کے کہا ہوا اور خود بخود ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ کیفیت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کی غزل کی شاعری بہت محتاط شاعری ہے ان کے یہاں کھل کھیلنے کے وہ انداز نظر نہیں آتے جو حسرت کی غزل کو اگر زندگی اور گرمی بخشتے ہیں تو اسے مجبوڈی، عام اور کچی بھی بنا دیتے ہیں۔"

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وحید نظم ہی کے شاعر ہیں البتہ ان کی نظم کا سانچہ اور اس کا اسلوب اس طرح کی نظم گوئی سے قریب ہے جو اب گزرے زمانے کی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ نظم نگاروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں چکبست، سرور جہان آبادی اور تلوک چند محروم وغیرہ آتے ہیں۔ اقبال کی ابتدائی نظمیں بھی اس ذیل میں آتی ہیں۔ وحید کی ان نظموں میں جس عنصر کی کمی ہے وہ داخلی عنصر ہے اسی لئے یہ نظمیں اس کرب اور تجسس سے عاری ہیں جس کی فاروقی صاحب کو تلاش ہے مگر یہ خصوصیت دراصل وحید کے شعری مزاج کی ہے۔ ان کے یہاں داخلیت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اسی لئے وہ غزلوں میں اور بھی زیادہ بے کیف نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی غزلیں ابتذال سے پاک ہوں اور نشیب و فراز کے بجائے ان میں ایک طرح کی ہمواری ملتی ہو مگر اس سے ان کی غزل میں کسی مثبت عنصر کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ان میں ایک طرح کی نظمیت ملتی ہے خارجی قسم کی نظمیت جو غزل کی تہ داری نرمی اور گھلاوٹ سے انھیں دور رکھتی ہے۔ وحید کو حسرت یا کسی غزل گو کے مقابلے میں رکھنا ایک طرح کی زیادتی ہوگی۔ ان کی جگہ نظم نگاروں کے ہی قبیلے میں ہوگی، وہ نظم نگار جو اقبال، چکبست اور جوش کے اسلوب سے آگے نہ بڑھ پائے بلکہ اسی دائرے میں رہ کر اب بھی مطمئن ہیں۔ روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کی نظمیں اسی طرز کی حامل ہیں البتہ ان میں تھوڑا بہت فرق موضوعات کی نوعیت سے ہو سکتا ہے۔ وحید نے زیادہ تر تاریخی عمارتوں اور اہم قومی و سیاسی شخصیتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ نظمیں ایک نئے انداز کا قصیدہ ہیں۔ دیکھنے میں شاندار مگر داخلی سوز و ساز اور شخصی تجربے سے خالی۔ اس طرح کی شاعری کو میں اکہری شاعری کہتا ہوں۔

مخدوم کے مجموعہ "بساط رقص" پر بھی فاروقی نے مفصل تبصرہ کیا ہے۔ مگر اس تبصرے میں زیادہ توجہ مخدوم کی ابتدائی دور کی نظموں پر صرف ہوئی ہے۔ اس دور کی نظمیں خواہ رومانی ہوں یا انقلابی و سیاسی اس نسل کی ترجمان ہیں جو ہیجان و انتشار کا شکار تھی۔ یہ سب شعرا جوش کی قیادت میں ایک طرح کی اعصاب زدہ شاعری کی تخلیق کر رہے تھے۔ مخدوم کے یہاں تو پھر بھی حسن ہے دوسرے شعرا کی نظمیں تو دوبارہ پڑھنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ مخدوم کے یہاں "گل تر" سے ایک واضح ارتقا ملتا ہے اور سچ پوچھیں تو یادگار شاعری انھوں نے اسی زمانے میں کی ہے۔ فاروقی نے بجا طور پر "چاند تاروں کا بن" اور "تحفت جگر" کو اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ اگر وہ ان نظموں کا مفصل تجزیہ کرتے اور ان کی معنویت و ندرت کو ابھارتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس رائے سے بھی اتفاق کرنا مشکل ہے کہ "چارہ گر،

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مراسلات

استفسار کے جواب میں

ایک استفسار کے ذریعہ "ہماری زبان" مورخہ ۱۵ رمئی ۱۹۶۸ء میں ڈی۔ اے ہیرسن قربان صاحب نے اس ڈیٹیل کا حال معلوم کرنا چاہا ہے جس کا ذکر مرزا غالب کے ایک خط میں پایا جاتا ہے دوسرے گئودان کی تصنیف کے وقت منشی پریم چند کہاں مقیم تھے اور ان کے کیا مشاغل تھے اس ضمن میں میری معلومات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرزا غالب کے حالات زندگی پر اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں اس واقعہ پر کوئی تفصیلی مواد موجود نہیں۔ البتہ مالک رام نے ذکر غالب کے صفحہ ۴۸ سے ۵۱ تک "نوجوانی کی رنگ رلیاں" کے زیر عنوان مرزا حاتم علی بیگ مہر کے خط کے حوالے کچھ مبہم اشارے کئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا ذکر مرزا غالب نے صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کے خط میں ہی "ستم پیشہ ڈومنی" کے الفاظ میں کیا ہے وہی اول اور آخر ہے۔ اس کے علاوہ تفصیلی طور پر اس کے حالات اور کسی جگہ نظر سے نہیں گزرے۔

(۲) گئودان منشی پریم چند کا آخری ناول ہے جو جون ۱۹۳۱ء مصنف کی وفات سے چار ماہ قبل انھیں کے زیر اہتمام انھیں کے مطبع سرسوتی پریس بنارس سے ہندی میں شائع ہوا تھا بعد میں اسے جامعہ ملیہ دہلی کے مکتبہ سے اردو میں شائع کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ بمبئی کی فلم کمپنیوں سے علیحدگی اختیار کر کے تا دم مرگ بنارس ہی میں مقیم رہے جہاں وہ اپنے مطبع سرسوتی کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے اس کے علاوہ ہندی میں ایک ماہنامہ ہنس بھی اپنے زیر ادارت شائع کرتے رہے۔

گئودان کی تصنیف و اشاعت کے تمام مراحل اسی زمانہ قیام بنارس میں انجام پذیر ہوئے مزید تفصیل کے لئے زمانہ کانپور کا پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء کا وہ مضمون ملاحظہ کیا جائے جو مدیر زمانہ منشی دیا نرائن نگم نے "پریم چند کی باتیں" کے زیر عنوان لکھا ہے۔

اس کے علاوہ منشی پریم چند کے ایک قریبی رفیق جناب مدن گوپال نے ان کے حالات زندگی پر ایک کتاب قلم کا مزدور لکھی ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے ابھی حال ہی بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(محمد ظہیر وارثی کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر)

فلموں میں اردو شعرا کا کلام

یہ بات تو صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ آباد اجداد کی وفات کے بعد ان کی ساری ملکیت اولاد کی وراثت میں آتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے دیوان و کلیات کا پاسبان اس کی اولاد ہوتی اگر اس کی غزلیات منظر عام پر نہیں آئی ہیں تو شائع کرا کے ایک یادگار کے طور پر رکھا اسی طرح اگر کوئی ادیب ہے تو اس کا بھی مسودہ بعد وفات محفوظ رکھا جائے۔ در اصل میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی اردو کل ہند کمیٹی بن جائے جس میں شعرا و ادبا کا ادبی ذخیرہ رکھا جائے۔ ہم شبانہ روز دیکھتے ہیں کہ کئی شعرا کا کلام فلموں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور ان سے کتنی ہی رقم کی کفایت ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایک مذکورہ بالا کمیٹی عمل میں لائیں۔ اگر کوئی فلمساز و موسیقار کسی بھی شاعر و ادیب کی ادبی تخلیق فلم میں پیش کرنا چاہتا ہے، تو اسے پہلے کمیٹی سے اجازت طلب کرنا ہوگی۔ اور جو بھی اس تخلیق کی واجبی و مناسب قیمت ہوا سے وہ ادا کرنا ہوگی۔ اور اس رقم کو کمیٹی کے کام میں لایا جائے، اور اسی رقم سے دیگر شعرا و ادبا پر ابھی سے ابھی کتب کا اجرا عمل میں لایا جائے۔ اس امر سے اردو ادب کی خدمت بھی ہوگی اور ادبی تشخص بھی برقرار رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقدام بہت ہی مجبوری کی حالت میں اٹھائے جائیں گے۔ کیونکہ آج اردو زبان کو ایک غیر ملکی و لاوارث زبان سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اسی بہانے اردو فروغ پائے گی۔ اور نت نئے پروگرام بھی اردو کے لئے عمل میں آئیں گے۔ اور امید ہے کہ اہل ذوق حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔ بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی استفادہ اٹھا سکتی ہیں۔ فلم مرزا غالب میں کتنی ہی غالب کی غزلیں مستعمل ہوئیں۔ اگر آج کوئی مذکورہ بالا کمیٹی ہوتی تو فلمساز، ہدایت کار و موسیقار صاحبان سے کچھ معاوضے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ مجاز کی غزلیں فلم ٹھوکر و آسمان محل میں لی گئیں۔ غالب و مجاز کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کی غزلیں و نظمیں بھی فلموں کی زینت کی اہم اجزا ثابت ہوئیں۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی غزلیں فلم لال قلعہ میں پیش کی گئیں۔ میں تو صرف ایک کمیٹی بنانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ محض اس لئے کہ آج اردو کمیٹیوں کے پاس اتنا فنڈ نہیں ہے کہ وہ آگے اقدام بڑھا سکیں۔ اگر یہ مشورہ سہی ہے کارآمد ہے تو پھر کہنا ہی کیا۔ میں فلمسازوں، ہدایت کاروں و موسیقاروں سے التماس کروں گا کہ اگر کوئی ایسی کمیٹی بنے تو ساتھ ہی آپ حضرات بھی پورے پورے تعاون سے اس کمیٹی کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

میں اہل ذوق حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مشورے کو عملی جامہ پہنا کر اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں مجھے امید ہے کہ فلمساز و موسیقار حضرات میری اس تجویز سے ضرور متفق ہوں گے۔ اگر اس مضمون میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو میری اصلاح فرمایئے اور مجھے شکرگزاری کا موقع عطا فرمایئے۔

(محمد خالد موتی محل روڈ بھوپال ایم پی)

شکاگو سے اردو ادب کے بارے میں نکلنے والا رسالہ "محفل"

شکاگو ۳۰ جون، اردو نہ صرف ماسکو ہی میں نہیں بلکہ یورپ اور امریکا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں جدید ترین طریقوں سے اردو پڑھانے کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہ مرکز اپنے طلبہ کو اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھی بھیجتا ہے۔ غیر ممالک میں اردو کے مقبول ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے شکاگو سے نکلنے والا رسالہ "محفل"۔ اس جریدے کے ایڈیٹر جناب کارلو کپولانے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اپنے جریدے "محفل" کے بارے میں کچھ اہم اور دلچسپ اطلاعات دیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جریدہ نکالنے کے بارے میں بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کیونکہ کوئی ایسا رسالہ ہونا ضروری تھا جس کے ذریعہ امریکا اور یورپ کے لوگوں کو صرف اردو ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب سے متعارف کرایا جائے۔ اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں چودھری محمد نعیم نے جو شکاگو میں اردو کے استاد ہیں، کارلو کپولا کی کافی مدد کی۔ اب یہ دونوں حضرات "محفل" کے ایڈیٹر ہیں۔ جریدہ نکالنے کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے دوستوں سے صرف ۲۰ ڈالر جمع کئے۔ کارلو کپولانے انٹرویو دیتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا کہ اس طرح صرف ۲۰ ڈالر میں "محفل" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس پہلے شمارے میں اردو کہانیوں کے ترجمے اور فیض احمد فیض کی نظموں کے ترجمے شائع کئے گئے تھے۔ کارلو کپولانے کہا: "بغیر کسی مالی تعاون کے "محفل" جیسے خالص ادبی رسالہ کا نکالنا ایک بہت دشوار گزار کام ہے۔ امریکا جیسے ترقی پسند ملک میں بھی اچھا ادب پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑی نہیں ہے۔ اسی لئے "محفل" ایک تجارتی رسالہ کی حیثیت سے ناکام ہو گیا جیسے کہ عام طور سے ادبی رسالے ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم نے اپنے حوصلے [illegible] سے "محفل" کی سہ ماہی اشاعت جاری رکھی۔ "محفل" میں اب تک اردو کے مشہور افسانہ نگاروں جیسے قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بیدی، عصمت کے افسانے اور فیض، مجاز، جذبی، اختر الایمان، ساحر اور بہت سے دیگر شعراء کے انگریزی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ کارلو کپولا پچھلے سال جولائی میں شکاگو سے اردو زبان و ادب کا مطالعہ کرنے علی گڑھ آئے ہیں۔ انھوں نے شکاگو میں اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مسز [illegible] جو بھی شکاگو میں ان کی طالبہ رہ چکی ہیں انھوں نے [illegible] (جو ان کی مادری زبان ہے) سے انگریزی میں کچھ اہم ترجمے کئے ہیں۔ کپولانے "محفل" کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اردو کے ادب پاروں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا ایک دشوار کام ہے۔ عام طور سے جو ہندوستانی ترجمے کرتے ہیں وہ کم از کم زبان کے اعتبار سے تو قطعی نامناسب ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کا مزاج انگریزی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ انگریزی میں اردو شاعری کی ساری خوبیوں کو ترجمہ کرنا ایک بہت دشوار اور دیر طلب مسئلہ ہے۔ ترجمے کے لئے دونوں زبانوں کا گہرا مطالعہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے خیال سے بہترین ترجمے اس صورت میں ہو سکتے ہیں جب کوئی ایسا شخص جس کی مادری زبان اردو ہو اور وہ کسی امریکی کے ساتھ مل کر ترجمے کرے۔ اس طرح انھیں ترجمے ہندوستانی طلبہ کے ساتھ مل کر کرنا پڑتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دوسرے امریکی بھی ہندوستانی ادب کا مطالعہ کرنے آئے ہیں۔ [illegible] نے بھی شکاگو میں اردو اور ہندی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اب "محفل" کے ایک سب ایڈیٹر ہیں اور علی گڑھ میں جدید ہندی کہانی کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اردو کی غیر ممالک میں مقبولیت اور "محفل" جیسے جریدے کا نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ایک ترقی یافتہ اور خوبصورت زبان ہے۔ ہر سال کافی طالب علم امریکا اور یورپ کے مختلف ممالک سے اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ہندوستان آتے ہیں۔

مکتوب بھوپال

مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر جرمنی روانہ

مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر جناب فخرالدین ترقی پسند کسانوں کے ایک ۸ رکنی وفد کے ہمراہ مشرقی جرمنی روانہ ہو گئے۔ اس وفد کے دورہ کا انتظام بھارت سرکار کی وزارت خوراک و زراعت نے کیا ہے۔ فخر بھائی کو اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے بھوپال انجمن ترقی اردو کے صدر جناب ایم عرفان اور انجمن کے دوسرے اراکین موجود تھے۔

غالب - ملک کے عظیم فرزند و یادگار عالمی شخصیت"

وکرم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہندی کے صف اول کے کوی ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن نے صوبائی غالب تقریبات کمیٹی میں شمولیت کے دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے لئے باعث صد فخر و مسرت قرار دیا ہے۔ آپ نے اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ صوبہ میں غالب کی صد سالہ تقریبات ہندوستان کے اس عظیم فرزند اور یادگار عالمی شخصیت کی شایان شان منائی جائیں۔ راجیہ پال کے سکریٹری اور انگریزی کے اسکالر جناب ولز کرشن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار اس وفد سے کیا جو آپ کو شمولیت کی دعوت دینے راج بھون میں گیا تھا۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان کو فراخ دلی سے اس ورثہ کو اپنانا چاہئے جو غالب کی دین ہے۔

بھوپال میں اردو میڈیم کا پہلا ہائی اسکول قائم

بھوپال کے اردو مدرسہ حمیدیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ مدھیہ پردیش کی راجدھانی کا پہلا اردو میڈیم کا ہائی اسکول ہوگا۔ اس سال مڈل کے شاندار نتائج کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے اسے ہائی اسکول میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایم پی انجمن کے آفس سکریٹری جناب حنا شگفتگی اور انجمن ترقی اردو بھوپال کے جنرل سکریٹری پروفیسر حسن مسعود نے اسے اردو کے لئے نیک شگون کی علامت قرار دیتے ہوئے اردو دوستوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے عملی تعاون اور مدد کے ذریعہ اپنا فرض ادا کریں۔

انجمن ترقی اردو ایچ۔ ای۔ ایل کی اہمیت تسلیم

انجمن ترقی اردو ہیوی الیکٹریکلز (بھوپال) کی اہمیت کو وہاں کی ٹاؤن شپ کی سماجی کمیٹی نے اپنے ایک یونٹ کی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ یہ کمیٹی کارخانہ کی تہذیبی انجمنوں اور اداروں اور سماجیوں کو ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ یہ ایچ۔ ای۔ ایل کی تسلیم شدہ کمیٹی ہے جو اپنے سے ملحقہ اداروں کو ریڈنگ روم، منصب پر دفتر کے لئے کمرہ، جلسوں اور تقریبات کے لئے جگہ فراہم کرتی ہے۔ اس کا تسلیم شدہ ادارہ ان سارے حقوق سے فیضیاب ہوتا ہے جو اس کے دائرہ عمل میں ہیں۔ اردو کا یہ پہلا ادارہ ہے جو تسلیم کیا گیا۔

مراسلاتی کورس میں اردو کی کوچنگ کا مطالبہ

انجمن ترقی اردو شہر بھوپال نے جناب شاکر علی خاں ایم ایل اے، جناب کے این پردھان ایم ایل اے، جناب قمر احمد حنیف ایڈیٹر ندیم، جناب اے آر رشدی ایڈیٹر افکار، جناب ممنون حسن خاں صدر انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی، جناب حسن مسعود جنرل سکریٹری اور جناب ایم عرفان صدر شہری انجمن کے دستخطوں سے چیرمین مدھیہ پردیش بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں انٹرمیڈیٹ میں اردو میں بھی مراسلاتی کوچنگ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

علامہ یوسف قیصر کا انتقال

بھوپال کے قدیم صحافی اور بزرگ شاعر و مصنف علامہ یوسف قیصر کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ علامہ تقریباً ۸۰ برس کے تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ لکھنؤ کے مشہور رسالہ الناظر اور اخبار اودھ پنچ سے بھی وابستہ رہے۔ بھوپال میں آپ کا انتقال کی خبر سے صف ماتم بچھ گئی۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو کوٹہ کا جلسہ

کوٹہ انجمن ترقی اردو کوٹہ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب شاغل عثمانی صاحب منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں پیش کی گئیں جن کو حاضرین جلسہ نے اتفاق رائے سے منظور فرمایا۔

ہم خواہان اردو کا یہ کثیر اجتماع جو انجمن ترقی اردو کوٹہ کے زیر اہتمام منعقد ہوا ہے۔ حکومت راجستھان سے اس کے منظور کردہ حسب ذیل مطالبات پر افسران محکمہ تعلیم سے واقعی طور پر عملدرآمد کرانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

(۱) اردو مادری زبان والے طلبہ کی مقررہ تعداد جن جن پرائمری اسکولوں میں پوری ہے وہ خواہ سرکاری طور پر چل رہے ہوں یا کمیٹیوں کے زیر اہتمام ہوں اردو کی تعلیم اردو کے ذریعہ جاری کرائے۔ (۲) مڈل اسکولوں میں اختیاری حیثیت سے جہاں جہاں اردو کا مطالبہ ہے اس کا اجراء کرائے (۳) سکنڈری اور ہائی اسکولوں میں جہاں جہاں طلبہ کا مطالبہ ہے۔ اختیاری اور لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کا انتظام کرایا جائے۔ (۴) جہاں جہاں ضرورت ہے اردو کے ٹیچروں کا واقعی طور پر انتظام کرائے۔ واضح رہے کہ اردو ٹیچرس کی کمی نہیں ہے مگر افسران متعلقہ دانستہ ان کا تقرر نہیں کرتے ہیں (۵) لسانی اقلیتی کمشنر الہ آباد کا تجویز کردہ رجسٹر تعداد طلبہ ہر اسکول میں رکھوایا جائے (۶) اردو کمیٹی مقررہ راجستھان کی تجویز کے مطابق ایپلیکیشن رجسٹر میں اردو کے طلبہ کی تعداد کا خانہ واقعی بڑھوایا جائے (۷) اردو کے ٹیچرس کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے (۸) پرائمری اسکول کے کورس کی کتابوں کی غلطیاں جلد از جلد دور کی جائیں (۹) اردو کے طلبہ کو سیکشنوں میں خلاف حکم گورنمنٹ نہ بانٹا جائے۔ (۱۰) ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۲۹ کے تحت کوئی شخص اپنی زبان مذہب اور نسل وغیرہ کی بنیاد پر کسی تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا لیکن باوجود اس کے متعدد سرکاری اسکولوں کے ہیڈ مدرسین اردو کے داخلوں میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اور صرف اردو کے طلبہ کا داخلہ یہ کہہ کر کہ جگہ نہیں ہے انکار کر دیتے ہیں ایسے ہیڈ مدرسین کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے۔

تجویز نمبر ۲۔ ہم خواہان اردو کا یہ کثیر اجتماع حکومت راجستھان سے مطالبہ کرتا ہے۔ (۱) کہ اس کی مقررہ کمیٹی متعلقہ کی میٹنگ فوری طور پر کی جائے۔ اور حسب قاعدہ اس کے دو جلسے ہر سال ہوا کریں اور اس کی خالی جگہ فوراً پر کی جائے۔ (۲) اردو کی کتابیں طبع کرانے پر جو دس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرنے کا اعلان چیف منسٹر صاحب نے کیا ہے اس پر فوری عمل کیا جائے۔ (۳) اردو کی کتابیں اسکولوں اور پبلک لائبریریوں میں خریدی جایا کریں۔ (۴) تمام قوانین و اعلانات اشتہارات اور دیگر معلومات کے متعلق لٹریچر اردو میں شائع کرایا جائے۔ (۵) دیگر ریاستوں کی طرح ریاست راجستھان سے بھی ایک اردو کا رسالہ جاری کیا جائے۔ اور اردو سیکشن کھلوایا جائے۔ (۶) جہاں جہاں اردو داں طبقہ اچھی تعداد میں ہے وہاں اردو داں P. R. O. مقرر کئے جائیں۔ (۷) ساہتیہ اکاڈمی راجستھان ادودے پور اردو کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے۔ اس کو ہدایت کی جائے کہ مثل دیگر زبانوں کے جن کو وہ منظور کر چکی ہے اردو پر بھی اس کا رقم صرف کرے۔ کتابیں چھپوائے، انعامات دے اور مستند ادباء شعراء کو وظیفہ دے اور انجمن ترقی اردو راجستھان کا مقرر کردہ نمائندہ اپنی کمیٹی میں شامل کرے۔

تجویز نمبر ۳۔ انجمن ترقی اردو کوٹہ جامعہ اردو علی گڑھ سے درخواست کرتی ہے کہ اس کے امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے لئے کسی مقامی پروفیسر یا مستند ہستی یعنی مہتمم امتحانات مقرر کیا جائے۔ اور اس ضلع کے دیگر مقامات کے لئے بھی یہاں سے موزوں شخص مہتمم سنٹر بنا کر بھیجے جایا کریں۔ تاکہ جامعہ کے مصارف بھی کم ہوں اور سنٹروں کو بھی سہولت ہو۔ مذکورہ بالا قرار دادیں پیش کر کے انجمن ترقی اردو کوٹہ امید کرتی ہے کہ راجستھان گورنمنٹ ان پر توجہ دے کر محبان اردو کی ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے گی۔

(عبد الرحیم ایڈوکیٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو کوٹہ راجستھان)

انجمن ترقی اردو کانپور کی مجلس عاملہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کانپور کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب سید قاضی محمد علی صاحب بتاریخ ۱۴ رجولائی ۶۸ بمقام دفتر انجمن ترقی اردو چمن گنج کانپور منعقد ہوا۔ جلسہ میں طے پایا کہ نئے سال کی ممبر سازی کا کام پوری شد و مد سے شروع کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ معززین شہر، ادباء، شعراء اور ممبران مجلس متعلقہ کا ایک جلسہ جلد سے جلد بلایا جائے اور ان حضرات کے مشورہ سے صوبائی کانفرنس بلانے پر غور کیا جائے تاکہ آئندہ اتر پردیش میں اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جا سکے۔ (عاشق ہمدانی سکریٹری)

انجمن ترقی اردو امرتسر کی ماہانہ ادبی نشست

امرتسر۔ انجمن ترقی اردو امرتسر کے زیر اہتمام تیسری ماہانہ ادبی نشست جناب بی۔ ایس۔ بج ایڈیٹر روزنامہ "ملک" کے دفتر واقعہ کورٹ روڈ میں زیر صدارت رائے بہادر پرکاش چندر پرکاش صدر انجمن ہذا منعقد ہوئی۔ جس میں امرتسر کے سرکردہ شعراء کرام کے علاوہ جناب صابر ابوہری ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ ٹیلیگراف، جناب پورن سنگھ ہنر، جناب کیشو رام کیشو ایس۔ ڈی۔ او ٹیلی، خوشتر، جناب راز سنتوکھ سری، جناب اندرجیت دت شرف اور جناب جے۔ ڈی۔ صابر ایم اے نے شرکت فرمائی۔ (رپورٹ پورن سنگھ ہنر)

انجمن ترقی اردو بہار کی خبریں

گڈا میں پبلک اردو لائبریری کا قیام

ہیرن پور استھال پرگنہ)۔ گڈا کے اردو دوستوں کا ایک عام جلسہ انجمن ترقی اردو شاخ گڈا کے زیر اہتمام زیر صدارت جناب کمال الدین صدیقی، نائب سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو و جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ ہیرن پور استھال پرگنہ) منعقد ہوئی۔ اولاً الحاج حبیب عالم و طیب علی صاحبان نے گڈا میں اردو لائبریری کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ متفقہ طور پر مندرجہ ذیل حضرات پبلک اردو لائبریری کے عہدہ دار منتخب ہوئے سرپرست: جناب صغیر احمد صاحب ایڈوکیٹ، صدر: جناب نذیر احمد صاحب وکیل، سکریٹری: جناب طیب علی کامل منظری خازن عبدالرزاق صاحب، لائبریرین: جناب حافظ خدا بخش صاحب، محصل: جناب شرف الدین صاحب۔

ممبران مجلس عاملہ۔ جناب منظور۔ شمس الحق۔ علاء الدین۔ معین الدین۔ عبد الصمد۔ محمد حاتم و محمد حنیف ٹیلر ماسٹر صاحبان۔ آخر میں صدر جلسہ جناب کمال الدین صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کرکے اردو زبان کو اس کا صحیح اور جائز مقام دلانے کے لئے جد و جہد کرنے کا پیغام دیا۔ انھوں نے لائبریری کے قیام پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اسے ایک اچھا شگون بتایا۔ ساتھ ہی اپنی اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے تعاون کا پورا پورا یقین دلایا۔ آخر میں صدر جلسہ کی اجازت سے جلسہ برخاست ہوا۔

انجمن ترقی اردو ہیرن پور کا جلسہ

جناب کمال الدین صدیقی نائب سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو و جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ ہیرن پور جب گڈا کے دورے پر آئے تو ان کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو شاخ گڈا کے زیر اہتمام ایک جلسہ انھیں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب الحاج حبیب عالم و جناب صغیر احمد ایڈوکیٹ صاحبان نے جناب کمال الدین صدیقی کی اردو کی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی اور امید ظاہر کی کہ ان سے اردو زبان کی بہت زیادہ خدمت ہو سکے گی۔ اردو لائبریری کے قیام کے سلسلہ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور انھیں سنتھال پرگنہ ضلع میں اردو زبان کا سالار اعظم کہا۔ آخر میں جناب کمال الدین صدیقی نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ سنتھال پرگنہ ضلع میں اردو تحریک کا مختصراً خاکہ پیش کیا اور یقین دلایا کہ اگر ضلع کے تمام اردو دوستوں کا تعاون مل سکا تو بہت زیادہ کام اردو زبان کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لئے ہو سکے گا۔ (نامہ نگار)

آسان اردو کی تعلیم ہی کے ذریعے نئی نسل لکھنؤ کی تہذیب سے روشناس ہو سکتی ہے

لکھنؤ، گورنر گوپالا ریڈی نے بانکا دو یا گنین کے لیے لکھنؤ ایجوکیشنل سوسائٹی کے لئے حاصل کی ہوئی عمارت کی رسم افتتاح ادا کی۔ اس موقع پر ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے گورنر نے طلبہ کردار اور ہمہ گیر شخصیت کی تعمیر کی ضرورت واضح کی اور اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہ لکھنؤ کی تہذیب تیزی سے مٹتی جا رہی ہے۔ گورنر نے کہا کہ اگر آسان اردو کی تعلیم بھی ساتھ ہی ساتھ دی جا سکے تو ممکن ہے کہ نئی نسل اردو ادب کے مطالعہ سے اس تہذیب کے بارے میں کچھ خیالات برقرار رکھ سکے پھر وہ چکبست جیسے شاعروں کو بھی سمجھ سکے گی۔ (سیاست)

بڑودہ میں ایک اردو لائبریری کا قیام

بڑودہ ۵ر جولائی۔ بزم محبان ادب کی طرف سے بڑودہ میں ایک اردو لائبریری کا قیام عمل میں آیا، جس کی رسم افتتاح جناب مظہر الحق صاحب علوی نے ادا فرمائی۔ اس کے بعد پروفیسر منصور صاحب قریشی کی زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں مقامی اور بیرونی شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کے بعد جناب مظہر الحق علوی اور دیگر اراکین بزم نے یہ تجویز پیش کی کہ بڑودہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی جائے۔ یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کرلی گئی چنانچہ اسی وقت سے کوششوں کا آغاز کر دیا گیا اور انشاء اللہ جلد ہی بزم محبان ادب انجمن ترقی اردو کے دفتر کی بھی رسم افتتاح ادا کرے گی۔

(معصوم بڑودوی۔ سکریٹری بزم محبان ادب بڑودہ)

اردو زبان کی فلاح و بہبود کی طرف حکومت ہریانہ توجہ دے گی

چنڈی گڑھ۔ ۱۰ر جولائی ٹیگور تھیٹر سدھارسبھا چنڈی گڑھ کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ کی صدارت فرماتے ہوئے چودھری رن سنگھ وزیر محنت و ترقیات ہریانہ نے اردو زبان کی ہر دلعزیزی اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ اردو کی ترقی تعمیر اور زبان کی حفاظت کے لئے جو طریقے ممکن ہوں وہ اختیار کئے جائیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کی طرف حکومت ہریانہ متوجہ ہوگی۔ مشاعرہ میں ملک کے جن مشہور شعرا حضرات نے حصہ لیا ان میں سے جناب معصوم، جناب شباب للت ایم۔ اے، جناب تسنیم ایم۔ اے، پروفیسر رام مورتی کمل ایم۔ اے۔ ایم ایڈ۔ پروفیسر رام کمار کوشل صادق انبالوی ایم۔ اے۔ ایم ایڈ، جناب پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے، جناب پرواز انبالوی ایم۔ اے، جناب راشد جلال آبادی، جناب ادم پرکاش ملک ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کنوینر انجمن ترقی اردو ہریانہ اور جناب جسپال کے نام قابل ذکر ہیں۔ (نامہ نگار)

پالیمنٹ میں ممبروں کو مادری زبان میں بولنے کا حق دلانے کی جدوجہد

نئی دہلی۔ لوک سبھا نے ایک غیر سرکاری بل پر نامکمل بحث کی جس کا مقصد آئین میں ترمیم کرکے پارلیمنٹ کے ممبروں کو ایوان کی کارروائی میں مادری زبان میں حصہ لینے کا حق دلانا تھا۔ بل دراوڑ منترکزہگم کے ممبر ایرا سیزیان نے پیش کیا تھا۔ اس کے ذریعہ آئین کے آرٹیکل ۱۲۰ میں ترمیم کرنا مقصود تھا۔ محرک نے کہا کہ وہ موقع دینے کا جو کا حیب ہر ممبر ایوان کے اندر اپنی مادری زبان میں بول سکے گا۔ جو لوگ ہندی یا انگریزی نہیں بول سکتے وہ بھی دس لاکھ افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اس وقت انہیں اسپیکر کو قائل کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہندی یا انگریزی میں اظہار خیال کرنے سے قاصر ہیں۔ ڈپٹی اسپیکر آر کے کھاڈلکر نے جو صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے بتایا کہ ممبروں کو اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ اپنے معروضات مادری زبان میں پیش کریں۔ (ریاستی)

جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اردو علی گڑھ سنٹر کوٹہ راجستھان

انجمن ترقی اردو شاخ کوٹہ کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم اسناد بتاریخ ۲۳ و ۲۴ جون ۱۹۶۸ء کو زیر صدارت جناب الحاج مولانا احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور منعقد ہوا۔ جناب عبدالرحیم ایڈوکیٹ جنرل سکریٹری نے انجمن ترقی اردو کوٹہ کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد کامیاب طلبہ کو صدر جلسہ نے اسناد تقسیم کیں۔ اس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جناب تابش سرونجوی، جناب میر وفائی، جناب سالک عزیزی جھنجھنوی، اور راہی بھوپالی کے علاوہ مقامی شعراء میں قمر، شاد، راز صاحبہ اور ناز صاحبہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا

صفحہ ۷ سے آگے

معنوی اور مکمل نظم ہے۔ ممکن ہے اس کا گیتوں کا لہجہ اور پھر فلم میں اس کی مقبولیت نے فاروقی کو بدگمان کیا ہو ورنہ واقعہ یہ ہے کہ "چارہ گر" اپنی جگہ پر ایک خوبصورت اور موثر نظم ہے مخدوم کی اور بھی متعدد نظموں پر انہیں غور کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ اس کے بعد بھی ان کے یہاں مسلسل تبدیلی اور ارتقا کا عمل جاری ہے۔ سردار جعفری کے مقابلے میں مخدوم کی تازہ نظمیں نئی شاعری سے زیادہ قریب ہیں اگرچہ وہ اپنی سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے نئی شاعری کے بارے میں نامناسب بیانات

دیتے رہتے ہیں۔

سردار جعفری پر تبصرہ بھی اچھا ہے اگرچہ صرف دو مجموعوں کو سامنے رکھنے سے ان کی شاعری کے بیشتر عیوب پر فاروقی کی نظر نہ جا سکی۔ اس تبصرے میں بعض جگہ متضاد خیالات بھی ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سردار کے اچھے اشعار میں جو چیز ہمیں فوراً متوجہ کرتی ہے وہ ان کے لہجے کی اشرافیت اور علویت ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔

"اگر عوامی شاعری کوئی چیز ہے تو اس کی جھلکیاں سردار کے یہاں ملتی ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ جس شاعری کی بنیادی خصوصیت علویت اور اشرافیت ہو وہ عوامی شاعری کبھی نہیں ہو سکتی۔ عوامی شاعری کی مثال جعفری کا کلام نہیں ہے بلکہ مطلبی فرید آبادی کی نظمیں اور گیت ہیں۔ ان کے مجموعے "پنہاری" "کسان رت" اور "ہیا ہیا" غالباً فاروقی کی نظر سے نہیں گزرے۔ فاروقی کے تبصروں سے اختلاف اور بھی جگہوں پر ہو سکتا ہے لیکن اس سے ان تبصروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہ تبصرے ہمیں اکساتے، چھیڑتے اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا